راہِ نجات

سُورۃ العصر کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

راہِ نجات

سورۃ العصر کی روشنی میں

ایک تقریر

جو ۱۵ فروری ۷۳ء کو ایچی سن کالج لاہور کے پرنسپل صاحب کی دعوت پر، کالج کے اساتذہ اور سینئر طلبہ کے ایک اجتماع میں پرنسپل صاحب کی زیرِ صدارت کی گئی۔

از

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501

اس کتابچے پر

بعض بزرگوں

نے یہ گرفت فرمائی ہے کہ اس کی بعض عبارات سے عاصی اور گنہگار اہلِ ایمان ۔ کے اپنے گناہوں کے بقدر سزا پانے کے بعد جہنّم سے رہائی پانے کی نفی ہوتی ہے۔ مَیں اس سے براء ت کرتا ہوں۔ میری رائے بھی یہی ہے کہ جس مسلمان کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا وہ بالآخر جہنّم سے نجات پا جائے گا۔ اِس کتابچے میں جہاں جہاں لفظ نجات آیا ہے اُس سے مراد 'اوّل وہلے میں نجات' ہے یعنی یہ کہ انسان کو جہنّم میں بالکل ڈالا ہی نہ جائے اور میدانِ حشر ہی میں رحمت و مغفرتِ خداوندی اُس پر سایہ فگن ہو جائے!

مزید برآں

اِس کتابچے کی زبان' قانون اور فتویٰ کی نہیں بلکہ ترغیب و ترہیب کی ہے ــــ ورنہ میرا موقف بھی وہی ہے جو امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کا ــــ یعنی گناہِ کبیرہ کے ارتکاب سے بھی کوئی شخص کافر نہیں ہوتا بلکہ مسلمان ہی رہتا ہے!

اِســـرار احمد

اشاعت 25 (اپریل 2015ء) ــــ 2200
ناشر ــــ ناظم نشر و اشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
مقامِ اشاعت ــــ 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور
فون: 3-35869501
مطبع ــــ شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور
قیمت ــــ 25 روپے

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ مسنونہ، تلاوتِ سورۃ العصر اور دُعا کے بعد:

محترم پرنسپل صاحب، اساتذۂ کرام اور عزیز طلبہ!

سب سے پہلے مَیں اللہ تعالیٰ کا شُکر ادا کرتا ہوں جس نے اپنے فضل و کرم سے ایسی سبیل پیدا فرما دی کہ آج پاکستان کی اس بلند پایہ درس گاہ میں مطالعۂ قرآنِ حکیم کی ہفت روزہ نشست کا آغاز ہو رہا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اگرچہ ظاہری اسباب و وسائل کا بالکل انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن اصلاً سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی حکمت و تدبیر سے ہوتا ہے۔ وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمۡرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ!

اس کے بعد مَیں پرنسپل صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے یہاں حاضر ہو کر اظہارِ خیال کا موقع عنایت فرمایا اور اساتذہ اور طلبہ میں سے بھی ان حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس اجتماع کے اہتمام میں حصّہ لیا ہے۔

جہاں تک مطالعۂ قرآنِ حکیم کی اہمیّت کا تعلّق ہے اس کے بارے میں آج میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ ان شاء اللہ العزیز اس کے مواقع بعد میں ملتے ہی رہیں گے، بلکہ خُدا نے چاہا تو ایک نشست خاص اس موضوع کے لیے وقف ہو گی۔

آج کے لیے مَیں نے طے کیا ہے کہ سورۃُ العصر کا مختصر مفہوم آپ کے سامنے بیان کروں۔ اِس انتخاب کے بہت سے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے ہاں دینیات کے نصاب میں ایک سلسلۂ کتب شامل ہے جس کا نام ہے "THE RIGHT PATH" چونکہ سورۃُ العصر کا بنیادی مضمون بھی یہی ہے، لہٰذا میں نے سوچا کہ مطالعۂ قرآنِ حکیم کے سلسلے کا آغاز اسی سورۂ مبارکہ سے کیا جائے۔

سورۃُ العصر کے بارے میں چار بنیادی باتیں

سب سے پہلے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں چار بنیادی باتیں ذہن نشین کر لیجیے:

۱۔ ایک یہ کہ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے یہ قرآنِ حکیم کی اوّلین سورتوں میں سے ہے۔ گویا کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم پر مکّی دَور کے بالکل آغاز میں نازل ہوئی۔

۲۔ دوسرے یہ کہ یہ قرآن مجید کی مختصر ترین سورتوں میں سے ہے۔ اس لیے کہ یہ کل تین آیات پر مشتمل ہے اور ان میں سے بھی پہلی آیت صرف ایک لفظ پر مشتمل ہے یعنی وَالْعَصْرِ

۳۔ تیسرے یہ کہ اپنے مضمون اور مفہوم و معنی کے اعتبار سے یہ قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورۃ ہے، اس لیے کہ قرآن مجید کتابِ ہدایت ہے (هُدًى لِّلنَّاسِ) یعنی انسان کو کامیابی اور فوز و فلاح کا راستہ دکھانے کے لیے نازل کیا گیا ہے تاکہ انسان نجات (SALVATION) کو حاصل کر سکے اور واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نجات کی جس راہ کی جانب لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے وہ نہایت اختصار لیکن حد درجہ جامعیّت کے ساتھ اس چھوٹی سی سُورۃ میں بیان ہو گئی ہے۔ اس اعتبار سے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پُورا قرآن مجید ایک درخت کی مانند ہے اور یہ چھوٹی سی سورۃ اُس کا بیج ہے اور جس طرح ایک بیج میں پُورا درخت پنہاں ہوتا ہے، اسی طرح سورۃ العصر میں پُورا قرآنِ حکیم موجود ہے۔

یہی وجہ ہے رصحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ان میں سے دو حضرات کی ملاقات ہوتی تھی تو وہ جُدا ہونے سے قبل ایک دُوسرے کو سُورۃ العصر ضرور سُنایا کرتے تھے۔ اور یہی سبب ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ اگر لوگ صرف اس ایک سُورۃ پر غور کریں تو یہ اُن کی ہدایت کے لیے کافی ہے بلکہ ان کا یہ قول

بھی نقل کیا گیا ہے کہ اگر قرآن مجید میں اِس سورۃ کے سوا اور کچھ نازل نہ ہوتا تو یہی ایک سُورۃ لوگوں کی ہدایت کے لیے کافی ہوتی۔

۴۔ چوتھے یہ کہ اِس سورۃ کے الفاظ بہت سادہ اور آسان ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہر زبان میں اس کے ادب کے شاہکار وہ ادب پارے قرار دیئے جاتے ہیں جن میں مضامین اور معانی تو بہت اعلیٰ اور بلند پایہ ہوں لیکن الفاظ نہایت آسان اور عام فہم ہوں۔ ایسے ہی ادب پاروں کو "سہلِ ممتنع" قرار دیا جاتا ہے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ اوّل تو پورا قرآن مجید ہی عربی زبان کا اعلیٰ ترین ادبی شاہکار ہے اور کُل کا کُل ہی سہلِ ممتنع ہے، لیکن اس میں بھی خاص طور پر یہ سورۃ مبارکہ تو سہلِ ممتنع کی اعلیٰ ترین مثال ہے جس میں مضامین کے اعتبار سے تو گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے لیکن ثقیل اور بھاری بھرکم لفظ ایک بھی استعمال نہیں ہوا۔

یہاں تک کہ ایک عام اُردو دان شخص کے لیے بھی اس میں کوئی لفظ نہ نامانوس ہے نہ مشکل۔ مثلاً اِس کا پہلا لفظ "والعصر" ہے اور عصر کا لفظ ہماری عام بول چال میں استعمال ہوتا ہے جیسے عصرِ حاضر، ہمعصر لوگ وغیرہ۔ اِسی طرح انسان کا لفظ تو گویا ہے ہی اُردو کا۔ پھر خُسر کو دیکھیے تو خسارہ، خسران وغیرہ الفاظ کا ہم عام استعمال کرتے ہیں۔ اِسی طرح ایمان، عملِ صالح، حق اور صبر بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ہماری ہی زبان کے الفاظ ہوں۔ بعض حروف جیسے اِنَّ لَفِیْ اور اِلَّا کے علاوہ صرف ایک لفظ یعنی تَوَاصَوْا ذرا نامانوس ہے لیکن اس کا بھی مصدر یعنی وصیّت ہماری بول چال میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

فہمِ قرآن کے دو درجے

اس سورۃ مبارکہ کا مفہوم بیان کرنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ ایک بنیادی بات

آپ کو بتا دوں اور وہ یہ کہ فہمِ قرآن کے بہت سے مراتب ہیں جن میں سے اوّلین یہ ہے کہ قرآن مجید کی کسی سُورۃ یا آیت میں جو اصل سبق (LESSON) پنہاں ہو اسے اخذ کر لیا جائے اور اس سے بنیادی رہنمائی (BASIC GUIDANCE) حاصل کر لی جائے۔ اسے خود قرآن مجید نے تذکّر بالقرآن کا نام دیا ہے اور اس اعتبار سے قرآن مجید نہایت آسان کتاب ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید پر غور و فکر کی بلند ترین سطح وہ ہے جسے قرآن مجید نے تدبّرِ قرآن قرار دیا ہے یعنی یہ کہ ہر ہر لفظ کی گہرائی میں اُتر کر اس کے معانی پر غور کیا جائے اور قرآن کے فلسفہ و حکمت کو اخذ کیا جائے۔ اس پہلو سے قرآن حکیم مشکل ترین کتاب ہے اور اس کے معانی کی تہ تک پہنچنا آسان کام نہیں ہے۔

آج کی اِس مجلس میں مَیں سورۃ العصر کا مفہوم مقدّم الذکر اعتبار سے قدرے تفصیل سے بیان کروں گا، تاکہ اس سورۃ مبارکہ کی بنیادی تعلیم اور اس کی اصل رہنمائی پُوری طرح واضح ہو جائے اور پھر کچھ مختصر اشارات مؤخر الذکر طریق پر بھی کروں گا تاکہ سوچنے سمجھنے والوں کو مزید غور و فکر کے لیے رہنمائی حاصل ہو جائے۔

(۲)

ترجمہ

اِس سورۃ مبارکہ کا سادہ ترین الفاظ میں ترجمہ یہ ہے:

زمانے کی قسم ہے کہ تمام انسان خسارے میں ہیں سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کیے اور باہم ایک دُوسرے کو حق کی تاکید کی اور باہم ایک دُوسرے کو صبر کی تاکید کی۔

عبارت کا تجزیہ (ANALYSIS)

ذرا غور کیجئے تو صاف نظر آجائے گا کہ اگرچہ اس سورۃ مبارکہ میں آیات تین ہیں، لیکن ان تینوں سے مکمّل جُملہ ایک ہی بنتا ہے۔ پہلی آیت ایک قسم پر مشتمل ہے۔ دوسری میں ایک قاعدۂ کلّیہ (GENERAL RULE) بیان ہوا ہے۔ اور تیسری میں اس قاعدۂ کلّیہ سے ایک استثناء (EXCEPTION) کا بیان ہے۔ اور تینوں آیتیں مِل کر ایک سادہ سی بات (SIMPLE STATEMENT) کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

اب مَیں چاہتا ہوں کہ آپ اِس سادہ سے فقرے کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے ذرا سے غور و فکر اور سوچ بچار سے چار نتائج اخذ کریں جو گویا کہ اس سورۃ مبارکہ کا اصل حاصل اور بنیادی سبق (LESSON) ہیں۔

کامیابی اور ناکامی کا معیار

سب سے نمایاں اور سب سے اہم حقیقت جو بالکل ظاہر و باہر ہے اور گویا اس جامِ حقیقت نُما سے خود بخود چھلکی پڑ رہی ہے یہ ہے کہ اس سورۃ میں انسان کی اصل کامیابی اور ناکامی اور اس کے حقیقی نفع و نقصان کا معیار پیش کیا گیا ہے۔

اِس حقیقت کو آپ سب اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں کہ ہر انسان اپنے سامنے کامیابی اور ناکامی اور نفع و نقصان کا کوئی نہ کوئی معیار ضرور رکھتا ہے اور اس کی ساری عملی جدّوجہد اور دنیا کی زندگی میں اس کی تمام محنت و مشقت کا رُخ اِس معیار ہی سے متعیّن ہوتا ہے۔ جو لوگ عقلی اعتبار سے بلوغ اور پختگی کو پہنچ چکے ہیں ان میں سے تو شاذ ہی کوئی ہو گا جس کا کوئی نہ کوئی متعیّن نصب العین (GOAL) اور مطمحِ نظر (IDEAL) نہ ہو، عموماً چھوٹے بچوں خصوصاً ان میں سے جو زیادہ ذہین ہوتے ہیں ان کے سامنے بھی کوئی نہ کوئی معیارِ مطلوب

ضرور ہوتا ہے، جس کے حصول کے لیے وہ اپنی محنت اور جدّوجہد کو مرتکز (CONCENTRATE) کر دیتے ہیں۔

ہم اگر ذرا دقّتِ نظر سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں بلکہ خود اپنے دل و دماغ میں جھانک کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے گا کہ اس دَور میں کامیابی اور ناکامی کا اصل معیار یا تو روپیہ پیسہ، مال و دولت اور زمین و جائیداد ہے یا حیثیّت، وجاہت، اقتدار اور دنیوی دبدبہ و جاہ و جلال اور عزّت و شہرت اور نام و نمود، چنانچہ الّا ماشاء اللہ سب لوگ اِن ہی چیزوں کی طلب میں لگے ہوتے ہیں اور ان ہی کے لیے انہوں نے اپنی ساری سعی و جہد اور محنت اور مشقّت کو صَرف کر دیا ہے۔ اکثر طلبہ کے ذہنوں میں بھی یا تو کسی ایسے فن کی تحصیل ہے جس سے خُوب دولت کمائی جاسکے یا پھر کسی حیثیّت و وجاہت والی پوزیشن کا حصُول ہے اور ان چیزوں کو حاصل کر لینا ہی ان کے نزدیک کامیابی ہے اور حاصل نہ کر سکنا ناکامی۔

سورۃ العصر سے جو عظیم حقیقت سامنے آتی ہے وہ اِس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کی کامیابی کا معیار نہ روپیہ پیسہ ہے، نہ حیثیّت و وجاہت، نہ جاہ و جلال ہے، نہ نام و نمود، بلکہ اس کی پہلی شرط ہے ایمان، دوسری شرط ہے عملِ صالح، تیسری شرط ہے تواصی بالحق اور چوتھی شرط ہے تواصی بالصبر۔ گویا ہر وہ انسان جس میں یہ چار چیزیں موجود نہ ہوں ایک ناکام، نامراد اور خائب و خاسر انسان ہے، چاہے وہ لکھ پتی ہی نہیں کروڑ پتی ہو بلکہ قارون کی سی دولت اسے حاصل ہو جائے اور چاہے کتنا ہی صاحبِ حیثیّت و وجاہت کیوں نہ ہو اور فرعون و نمرود کی سی بادشاہی ہی کیوں نہ حاصل کر لے۔ اور اس کے برعکس (CONVERSELY) ہر وہ شخص کامیاب اور بامراد اور فائز المرام ہے جس میں یہ چاروں چیزیں موجود ہوں، چاہے اس کے پاس مال و دولتِ دنیوی سِرے سے موجود نہ ہو بلکہ اسے فاقوں سے سابقہ ہو، اور چاہے وہ جائیداد اور متاع و اسبابِ دنیوی سے کتنا ہی تہی دست کیوں نہ ہو، یہاں تک کہ اس کے پاس سر چھپانے تک کو جگہ نہ ہو، اور چاہے وہ دنیا میں کتنا ہی

غیر معروف اور گمنام کیوں نہ ہو، یہاں تک کہ کوئی اسے پوچھتا تک نہ ہو۔

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس حقیقت کو سرسری طور پر مان لینا جس قدر آسان ہے اس پر دل کا ٹھک جانا اسی قدر مشکل ہے۔ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے اور ہم اس کے ظواہر سے لازماً متأثر ہوتے ہیں اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں آرام و آسائش اور عزّت و شہرت روپے پیسے اور اسباب و وسائل ہی سے وابستہ ہے تو ہم بے اختیار ان چیزوں کے حصول کے لیے کوشاں ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، کیا جائز ہے اور کیا ناجائز اور کیا حلال ہے اور کیا حرام۔ گویا اس دنیا کی زندگی میں ہمارے رویے اور طرزِ عمل کی درستی کا تمام تر انحصار اسی بات پر ہے کہ ہمارا کامیابی اور ناکامی اور نفع و نقصان کا معیار بدل جائے چنانچہ یہی اس سورۂ مبارکہ کا اصل سبق (LESSON) ہے۔

آپ خود غور کریں گے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اگر وہ سادہ سی حقیقت جو اس عظیم سورۃ میں بیان ہوئی ہے ہمارے ذہن نشین ہو جائے اور وہ سادہ سا جملہ جس پر یہ سورۃ مشتمل ہے ہماری لوحِ قلب پر کندہ ہو جائے تو ہمارے نقطۂ نظر میں کیسا عظیم انقلاب برپا ہو جائیگا، ہماری اقدار (VALUES) کتنی بدل جائیں گی اور عملی زندگی میں ہمارا رویّہ (ATTITUDE) کس قدر تبدیل ہو جائے گا۔ جو چیز پہلے اہم ترین نظر آتی تھی اب انتہائی حقیر نظر آئے گی اور جو پہلے بالکل غیر وقیع نظر آتی تھی اب انتہائی اہم محسوس ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی زندگی میں جو عظیم انقلاب برپا ہوا اس کی تہ میں نقطۂ نظر کی یہی تبدیلی کارفرما تھی اور نقطۂ نظر کی اسی تبدیلی کا کرشمہ تھا کہ انہیں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاجوئی کے مقابلے میں دنیا و ما فیہا بالکل حقیر نظر آتے تھے حتیٰ کہ انہیں زندگی کی نسبت موت زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔

الغرض، اس سورۂ مبارکہ کا اصل سبق یہی ہے اور ہم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ اس کا خوب مراقبہ کرے اور اسے اچھی طرح ذہن نشین بھی کرے اور جاگزینِ قلب بھی۔

نجات کی کم از کم شرائط اور اس کے ناگزیر لوازم

دوسرا بنیادی نتیجہ جو اس جملے کی ترکیب (CONSTRUCTION) سے خود بخود حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ اس سورۃ میں نجات کی کم از کم شرائط بیان ہو رہی ہیں اور اس کے ناگزیر لوازم کا ذکر ہے، نہ کہ کامیابی کی بلند ترین منازل یا فوز و فلاح کے اعلیٰ مراتب کا۔ گویا یہ نجات (SALVATION) کے کم از کم (MINIMUM) تقاضوں کا بیان ہے اور ان سے کم پر نجات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ سادہ لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کامیابی کی فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ صرف آخر درجہ میں پاس ہونے کی شرح (MERE PASS PERCENTAGE) کا بیان ہو رہا ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسرا نتیجہ بھی عملی اعتبار سے نہایت اہم ہے اور اسی کو فراموش کر دینے کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں شدید اخلاقی و عملی انحطاط پیدا ہوا۔ اس لیے کہ فطری طور پر انسان میں محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کا مادہ کامیابی کے کم از کم معیار کی نسبت اور تناسب ہی سے پیدا ہوتا ہے اور ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو خصوصاً دینی معاملات میں اعلیٰ مراتب اور بلند مقامات کے لیے کوشاں ہوں۔ اس کے برعکس عظیم اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے نجات کے کم از کم لوازم کو پورا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں نجات کے کم از کم تقاضوں کو نہایت سادہ الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے تاکہ لوگ اپنی اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق ان کو پورا کرنے پر کمربستہ ہو سکیں۔

چاروں شرطیں لازمی ہیں

تیسرا نتیجہ جو اسی دوسرے نتیجہ کی فرع (COROLLARY) ہے یہ ہے کہ نجات

کے لیے ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق، تواصی بالصبر چاروں لازم ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ یہ کلامِ الٰہی ہے، اس میں کوئی حرف بھی ضرورت سے زائد اور محض ردیف وقافیہ کی ضرورت کے تحت یا غیر ضروری مبالغہ آمیزی کے لیے نہیں ہے۔ اور جب یہاں خسارے اور ناکامی سے نجات کی شرائط کے ضمن میں چار چیزوں کا بیان ہوا ہے تو یقیناً وہ چاروں ہی چیزیں لازمی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط کر دیا جائے تو انسان کی نجات کی ذمہ داری قرآن حکیم پر نہیں رہے گی۔ بالکل ایسے ہی جیسے اگر کوئی ماہر معالج کسی مریض کو چار ادویات پر مشتمل نسخہ لکھ کر دے اور مریض اپنی مرضی سے اس میں سے کسی ایک دوا کو کم کر دے تو اب اس نسخہ کی ذمہ داری اس معالج پر نہیں ہوگی بلکہ خود اُس مریض پر ہوگی۔

اِس حقیقت پر زور دینا اِس لیے ضروری ہے کہ ہم مسلمانوں کی عظیم اکثریت کے ذہنوں میں یہ غلط بات بیٹھ گئی ہے کہ ہر کلمہ گو کی نجات لازمی ہے، گویا نجات کے لیے صرف ایمان اور اس کا بھی محض زبانی اقرار کافی ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی کچھ عمل بھی کر لے تو یہ اضافی نیکی ہے اور اس سے اس کے درجات بلند ہو جائیں گے ورنہ محض نجات کے لیے عمل ضروری نہیں ہے۔ بہت کم تعداد ایسے لوگوں کی آپ کو ملے گی جو ایمان کے ساتھ تھوڑے بہت عمل کو بھی کسی درجے میں نجات کے لیے ضروری سمجھتے ہوں۔ یہ تھوڑی تعداد بھی تواصی بالحق اور حق کی دعوت واشاعت کو تو ہرگز ہر شخص کے لیے لازم نہیں سمجھتی اور یہ خیال بالکل یقینی سا گردانا جاتا ہے کہ حق کی تبلیغ وتلقین تو بس ایک مخصوص گروہ ہی کا کام ہے۔ باقی لوگوں کے لیے نہ صرف یہ کہ دعوت وتبلیغ لازمی نہیں ہے بلکہ مناسب بھی نہیں۔ پھر اس خاص گروہ نے بھی بالعموم کامل اور مکمل حق کی تبلیغ سے ابتلا وآزمائش کو دعوت دینے کی عزیمت کی راہ کو چھوڑ کر زیادہ تر رخصتوں پر اپنے عمل کا دارومدار رکھ دیا ہے، اور اس طرح پوری اُمّت پر بے عملی، جمود، تعطّل اور عمل سے گریز اور فرار کی ذہنیت کا تسلّط ہو گیا ہے اور اس صورتِ حال

میں کوئی تبدیلی اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ نجات کے لیے عملِ صالح بھی ناگزیر ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حق کا اقرار و اعلان اور اس کی دعوت و شہادت بھی لازمی ہے، اور اِس راہ میں جو مصیبت یا تکلیف آئے اس پر ثابت قدم رہنا بھی۔ چنانچہ یہی وہ عظیم حقیقت ہے جو اس انتہائی مختصر مگر نہایت جامع سورۃ میں بیان ہوئی ہے۔

ان چاروں چیزوں کے مابین جو عقلی اور منطقی ربط ہے اسے بھی سمجھ لینا ضروری ہے۔ کسی انسان کا صاحبِ سیرت و کردار قرار پانا اس پر منحصر ہے کہ وہ ہر معاملہ میں اوّلاً یہ دیکھے کہ صحیح بات کیا ہے۔ پھر جس بات کی صحت پر اِس کے دل و دماغ گواہی دے دیں اس کو عملاً اختیار کرے اور نہ صرف خود اختیار کرے بلکہ اِس کا اقرار و اعتراف اور اعلانِ عام بھی کرے اور دوسرے لوگوں کو بھی اِس کو ماننے اور قبول کرنے کی دعوت دے، اور پھر اگر اس راہ میں کوئی دِقّت پیش آئے یا ایثار و قربانی اور سرفروشی و جانفشانی کا مرحلہ آجائے تو پامردی و استقلال کا ثبوت دے اور پیٹھ دکھا کر بھاگ نہ جائے۔ کسی شریف اور صاحبِ کردار انسان کے لیے ان مراحل میں سے کسی میں بھی کوئی دوسری روش اختیار کرنا ممکن نہیں۔ بصورتِ دیگر وہ ایک بودا، تھڑدلا اور کمزور سیرت و کردار کا حامل انسان قرار پائے گا، نہ کہ ایک شریف اور صاحبِ کردار انسان۔ چنانچہ یہی عقلی ربط اور منطقی ترتیب (LOGICAL SEQUENCE) ہے ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر میں۔ اور کسی بھی صاحبِ کردار انسان کے لیے اِن میں سے کسی ایک سے بھی کنی کترانا ممکن نہیں۔

زورِ کلام۔ اور انتہائی تاکید و توثیق

چوتھا اور آخری نتیجہ جو اس مختصر سی سُورۃ کی عبارت کے تجزیے سے حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ متذکرہ بالا تینوں نتائج سرسری نہیں بلکہ انتہائی مؤکّد اور مُوثّق ہیں اور اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، اس لیے کہ اوّل تو ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے

اور اللہ کی فرمائی ہوئی بات اپنی صداقت اور حقانیت پر خود آپ ہی دلیلِ کامل ہے: وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا (اور اپنے قول میں خدا سے زیادہ سچا اور کون ہو سکتا ہے؟) لیکن اس پر اکتفا نہیں بلکہ خود خدا نے بھی ان حقائق پر قسم کھائی ہے اور اس طرح یہ کلام انتہائی مؤکد ہو گیا ہے اور اس میں جو حقائق مضمر ہیں اور انسان کے لیے جو سبق پنہاں ہیں وہ سب انتہائی یقینی اور ہر قسم کے شکوک و شبہات سے منزّہ اور مبرّا ہیں یعنی یہ کہ یقیناً نوعِ انسانی بحیثیتِ مجموعی گھاٹے اور خسارے سے دوچار ہونے والی ہے اور ہلاکت و تباہی کا نوالہ بننے والی ہے سوائے ان افرادِ نوعِ انسانی کے جو ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر چاروں لوازم کو پورا کریں اور نجات کی اس کسوٹی پر بحیثیتِ مجموعی پورے اُتریں۔

الغرض یہ ہیں وہ چار بنیادی نتائج جو اس سورۂ مبارکہ پر بحیثیتِ مجموعی ادنیٰ تأمل اور سرسری غور و فکر سے حاصل ہوتے ہیں۔ گویا یہ ہے تذکّر کی سطح پر سورۃ العصر کا اصل ماحصل!

(۳)

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات اس سورۂ مبارکہ کے ایک ایک لفظ کو قدرے گہرائی میں اُتر کر سمجھنے کی کوشش کریں اور بطورِ خود دیکھیں کہ اس سورۂ عظیمہ کی ظاہری سلاست کے پردوں میں کیسے کیسے عظیم حقائق مضمر ہیں اور کیسی کیسی اعلیٰ حکمتیں اور دانائیاں پنہاں ہیں اور اس طرح غالب مرحوم کے اس شعر سے بھی لطف اندوز ہوں کہ ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے!
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

اور اس کے اس مصرعے کی بھی داد دیں کہ

زیرِ ہر لفظ غالب چیدہ ام میخانۂ

اس لیے کہ غالب نے اپنے کلام کے بارے میں تو یہ باتیں بس شاعرانہ تعلّی ہی میں کہہ دی ہیں لیکن قرآنِ حکیم واقعۃً ان کا مصداقِ کامل ہے۔

"وَالعصر" کا حقیقی مفہوم

سب سے پہلے لفظ "وَالعصر" کو لیجیے جس کا سادہ سا ترجمہ ہم "زمانے کی قسم" کر آتے ہیں۔

"عصر" کا اصل مفہوم صرف زمانہ نہیں بلکہ تیزی سے گزرنے والا زمانہ ہے۔ عربی میں عصر اور دہر کے دو الفاظ بہت جامع ہیں اور ان دونوں میں صرف زمان (TIME) نہیں بلکہ زمان اور مکان کے مرکب (TIME & SPACE COMPLEX) کی جانب اشارہ ہے۔ اور حسنِ اتفاق سے قرآن مجید میں 'العصر' اور 'الدہر' دونوں ہی ناموں کی سورتیں موجود ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ دہر میں مرکبِ زمان و مکان کی وسعت کا لحاظ ہے یا جدید فلسفے کی اصطلاح میں یوں کہہ لیں کہ زمانِ مطلق (ABSOLUTE TIME OR PURE DURATION) مراد ہے، جبکہ لفظِ عصر میں زمانہ کا مرور اور اس کی تیز روی کی جانب اشارہ ہے۔ گویا فلسفیانہ اصطلاح میں زمانِ جاری یا زمانِ مسلسل (SERIAL TIME) مراد ہے۔

"والعصر" میں حرفِ واو حرفِ جار ہے اور اس کا مفاد قسم کا ہوتا ہے اور قسم سے اصل مراد شہادت اور گواہی ہے۔

گویا لفظ "والعصر" کا حقیقی مفہوم یہ ہوا کہ "تیزی سے گزرنے والا زمانہ شاہد ہے اور گواہی دے رہا ہے!"

خسران کا وسیع مفہوم

اسی طرح دوسری آیت کا سادہ ترجمہ بھی ہم نے یہ کیا ہے کہ پوری نوعِ انسانی گھاٹے اور خسارے میں ہے لیکن اس سے بھی اصل مفہوم ادا نہیں ہوتا، اس لیے کہ خسران قرآنی اصطلاح میں صرف دو چار ہزار یا دو چار لاکھ کے گھاٹے کو نہیں بلکہ کامل تباہی اور بربادی

کو کہتے ہیں۔ چنانچہ کامیابی اور بامرادی کے لیے تو قرآنِ حکیم میں متعدّد الفاظ استعمال ہوئے ہیں جیسے فوز و فلاح اور رشد و سعادت، لیکن اِن سب کی کامل ضد (ANTONYM) کی حیثیت سے ایک ہی جامع لفظ استعمال ہوتا ہے اور وہ ہے خُسران۔ گویا دوسری آیت کا اصل مفہوم یہ ہوا کہ "پوری نوعِ انسانی تباہی اور ہلاکت و بربادی سے دوچار ہونے والی ہے"!

اس عظیم آیت میں جو اہم حقیقت بیان ہوئی ہے اور نوعِ انسانی کے جس المیے (HUMAN TRAGEDY) کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے اس کا صحیح فہم و ادراک دو مرتبوں (STAGES) میں ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ہر انسان اِس دنیا کی زندگی میں شدید قسم کی محنت و مشقّت سے دوچار ہے۔ اکثر لوگوں کو اپنی اور اپنے لواحقین (DEPENDENTS) کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرنے کے لیے صبح سے شام تک کمر توڑ دینے والی مشقّت کرنی پڑتی ہے اور پھر بھی بنیادی ضرورتیں (BASIC NECESSITIES) تک پوری نہیں ہوتیں چنانچہ انسانی آبادی کی ایک عظیم اکثریت غذا، لباس، مکان، تعلیم اور علاج معالجہ جیسی بنیادی چیزوں تک سے مناسب حد تک بہرہ اندوز نہیں ہے۔ جو لوگ نسبتاً خوشحال ہیں، انہیں بھی بہرحال محنت اور مشقت کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

اِس حد تک تو پھر بھی انسان زیادہ سے زیادہ ایک باربرداری کے جانور سے مشابہ ہے لیکن اِس کا مزید المیہ یہ ہے کہ اِس میں احساسات بھی بے پناہ موجود ہیں، لہٰذا اسے ان مشقّتوں پر مستزاد بے شمار قسم کے صدمات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کبھی اولاد کی محبّت اُسے رُلاتی ہے تو کبھی اعزّہ و اقارب کے دُکھ اُسے بانٹنے پڑتے ہیں، کبھی یہ کسی عزیز کی بیماری کا غم سہہ رہا ہوتا ہے تو کبھی کسی محبّ یا محبوب کی موت کا صدمہ برداشت کرتا ہے۔ الغرض اِس کے لیے صرف محنت و مشقّت ہی ضروری نہیں بلکہ رنج و الم بھی لازمی ہیں۔ بقول غالب ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

آپ کو یقیناً معلوم ہوگا کہ حیاتِ انسانی میں اسی درد اور دکھ اور رنج و الم کے مشاہدے سے مہاتما گوتم بدھ اِس درجہ دل برداشتہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے عین جوانی کے عالم میں نوجوان بیوی اور معصوم بیٹے کو سوتے چھوڑ کر جنگل میں جا دھونی رمائی تھی۔

خوشحال اور دولت مند لوگوں کے بارے میں عوام کو اکثر یہ مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ شاید انہیں کوئی دکھ نہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جس نوع کے نفسیاتی کرب (PSYCHIC AGONY) سے ان کی اکثریت دوچار ہوتی ہے اس کا اندازہ بھی عام آدمی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انہیں بے شمار قسم کے تضاداتِ ذہنی (CONFLICTS) اور مایوسیوں (FRUSTRATIONS) کا سامنا رہتا ہے اور اکثر و بیشتر امراضِ دماغی (MENTAL DISEASES & PSYCHIC DISORDERS) کا شکار اسی طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔

یہ دراصل انسانی المیے کا پہلا درجہ ہے اور اسی کا ذکر قرآن حکیم کے تیسویں پارے میں سورۃ البلد کی اس آیت میں نہایت فصاحت و بلاغت سے ہوا ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ "ہم نے انسان کو مشقت ہی میں پیدا کیا ہے"!

اِس پر مستزاد یہ ہے کہ اِس کا المیہ دنیا کی زندگی ہی میں ختم نہیں ہوتا بلکہ موت کے بعد اِس کا اصل اور سخت تر مرحلہ شروع ہوتا ہے گویا بقولِ شاعر ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

انسانی ٹریجڈی یعنی المیے کا نقطۂ عروج (CLIMAX) یہ ہے کہ دنیا کی ساری محنتیں اور مشقتیں جھیل کر اور ساری کلفتیں سہہ کر اچانک اسے اپنے خالق و مالک کے سامنے محاسبے کے لیے بھی پیش ہونا پڑے گا، جہاں اسے اپنی زندگی بھر کے اعمال و افعال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ یہی نقشہ ہے جو قرآن کریم کی اِس آیۂ کریمہ میں کھینچا گیا ہے یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ[1] "اے انسان تجھے مشقتیں سہتے، کھپتے کھپتے

---

[1] الانشقاق: ٦

بہر حال اپنے رَبّ کی خدمت میں حاضر ہونا ہے" ——— اور پھر اگر اس محاسبے میں اس کے خیالات و اعتقادات اور افعال و اعمال میں کجی کا پہلو غالب نکلا تو اُسے ہمیشہ ہمیش کے لیے دردناک سزا اور اذیّت بخش عذاب کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور یہی اصل خُسران ہے۔ (ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ)[1] اور مختصراً یہ ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کا حقیقی مفہوم

پہلی دو آیتوں کا باہمی ربط

یہ تو واضح ہے کہ پہلی آیت ایک قسم پر مشتمل ہے اور دوسری جوابِ قسم پر، یعنی دوسری آیت میں ایک حقیقت کا بیان ہے اور پہلی میں اس پر زمانے کی گواہی کی جانب اشارہ ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں کے مابین منطقی ربط کیا ہے؟

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر یعنی زمانِ جاری یا زمانِ مسلسل ایک ایسی چادر کی مانند ہے جو ازل سے ابد تک تنی ہوئی ہے۔ گویا زمانہ انسان کی تخلیقِ اوّلین سے لے کر نہ صرف انسان کی حیاتِ دنیوی اور اس کی پوری تاریخ بلکہ حیاتِ اُخروی اور اس کے جملہ مراحل کا چشم دید گواہ ہے۔ چنانچہ انسان کی محنت و مشقت اور رنج و الم سے بھرپور زندگی بھی اس کی نگاہوں کے سامنے ہے اور قوموں کے عروج و زوال کے تمام واقعات کا بھی وہ چشم دید گواہ ہے اور حیاتِ اُخروی میں انسانی ٹریجڈی کا نقطۂ عروج بھی گویا اس کے بالکل سامنے موجود ہے۔ اس طرح اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کا سب سے بڑا شاہد گویا زمانہ ہی ہے!

اِس حقیقتِ ثابتہ پر ایک تنبیہ اور انذار کا مزید رنگ ہے جو لفظ والعصر کے اِستعمال سے پیدا ہو گیا ہے اور وہ یہ کہ انسان کی ہلاکت اور تباہی اور خسرانِ حقیقی کا اصل سبب یہ ہے کہ اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ماحول اور اپنے فوری مسائل و معاملات

---

[1] الحج : ۱۱

میں اُلجھ کر گویا گمشدگی کی سی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے!
مومن کی یہ پہچان کہ گُم اُس میں ہیں آفاق

وَالعَصر کا لفظ انسان کو جھنجھوڑ کر غفلت سے بیدار کرتا ہے کہ غافل انسان تیرا اصل سرمایہ وہ وقت ہے جو تیزی سے گذرا جا رہا ہے اور تیری اصل پونجی یہ مہلتِ عُمر ہے جو سُرعت سے ختم ہو رہی ہے اور اگر تو نے اِس میں اپنی شخصیت کی تعمیر نہ کر لی یا بقول علامہ اقبال اپنی خودی کو بلند نہ کر لیا تو پھر ابدی ہلاکت اور تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا گویا بقول شاعر ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی

ایمان کا اصل مفہوم

اِس خُسرانِ عظیم اور تباہی اور بربادی سے نجات کی شرطِ اوّل ایمان ہے۔ ایمان کا لفظ اَمن سے بنا ہے اور اس کے لفظی معنی ہیں کسی کو امن دینا اور سکون بخشنا لیکن اصطلاحی معنی میں 'ل' یا 'ب' کے صِلوں (PREPOSITIONS) کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اٰمَنَ لَہٗ یا اٰمَنَ بِہٖ اور اِس صُورت میں اِس کے لفظی معنی تصدیق اور یقین و اعتماد کے بن جاتے ہیں۔

ایمان کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آپ اس حقیقت پر غور کریں کہ ہر وہ انسان جو عقل اور شعور کی پختگی کو پہنچ جائے لازماً یہ سوچتا ہے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں اور کائنات کیا ہے اور اِس کی ابتداء اور انتہا کیا ہے اور خود میرے سفرِ زندگی کی آخری منزل کون سی ہے۔ جن لوگوں نے فلسفہ کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے

وہ جانتے ہیں کہ پوری انسانی تاریخ کے دوران میں تمام سوچنے اور سمجھنے والے لوگ ان ہی سوالات پر غور و فکر کرتے رہے ہیں اور ان ہی کا اطمینان بخش جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے بغیر انسان بالکل اندھیرے میں ہے کہ نہ وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہے نہ کائنات کی حقیقت پر مطلع۔ اور نہ اپنے آغاز و انجام کی خبر اسے حاصل ہے نہ کائنات کی ابتدا و انتہا کا علم، گویا بقولِ شاعر ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم

اب ظاہر ہے ان سوالات کا حتمی اور یقینی جواب ہم اپنے حواس سے ہرگز معلوم نہیں کر سکتے۔ ہم ابھی اس عالمِ طبیعی (PHYSICAL WORLD) کی وسعتوں کے بارے میں بھی کوئی اندازہ نہیں کر پائے، کجا یہ کہ اس کی ابتدا اور انتہا کا علم ہمیں حاصل ہو۔ اسی طرح اس سوال کا جواب بھی کہ آیا اس دنیا میں پیدائش سے قبل بھی ہماری کوئی حقیقت تھی یا نہیں اور موت کے بعد بھی ہمارا کوئی وجود برقرار رہے گا یا نہیں، حواس کے ذریعے ممکن نہیں، اس لیے کہ ہم اپنے حواس کے ذریعے نہ پیدائش سے پہلے کی دنیا میں جھانک سکتے ہیں اور نہ موت کے بعد کے عالم میں۔ غرض علمِ حقیقی کے بارے میں انسان کی مجبوری اور بے بسی کا یہ عالم ہے۔

اس پس منظر میں غور کیجیے کہ تاریخِ انسانی کے دوران مسلسل بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے لوگوں کو بتایا کہ ہمارے پاس ایک خاص ذریعۂ علم (وحی) ہے، جس کی بنا پر ہم حتمی اور یقینی طور پر جانتے ہیں کہ یہ کائنات نہ ہمیشہ سے تھی، نہ ہمیشہ رہے گی۔ بلکہ اسے ایک خالق نے پیدا کیا ہے جو تمام صفاتِ کمال سے بدرجۂ تمام و کمال متصف ہے اور اپنی ذات و صفات میں تنہا و یکتا ہے اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اسی نے تمہیں پیدا کیا اور تمہاری زندگی بس یہی دنیا کی زندگی نہیں بلکہ وہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ

زندہ کرے گا اور وہ تمہاری اصل اور دائمی زندگی ہوگی۔ اور اُس زندگی میں تمہارے ساتھ مُعاملہ اور سلوک اِس زندگی کے خیالات و عقائد اور افعال و اعمال کی بنیاد پر ہوگا اور اُسی خالق و مالک نے ہمیں اس پر مامُور کیا ہے کہ ہم تمہیں ان حقائق سے بھی آگاہ کر دیں اور اِس دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ بھی بتا دیں تاکہ تم اُس اُخروی زندگی میں خُسران سے بچ سکو اور فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو سکو۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ان حضرات ہی کو ہم انبیاء اور رسل کے نام سے جانتے ہیں اور ان ہی کی تصدیق کا نام ایمان ہے، جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک زبانی اقرار اور دوسرے قلبی یقین یعنی زبان سے یہ گواہی دینا کہ ہم رسُولوں کی بھی تصدیق کرتے ہیں اور ان کی تعلیمات کے مطابق خدا کو بھی مانتے ہیں اور اس کی جُملہ صفات کو بھی اور بعث بعد الموت، حشر و نشر، حساب کتاب اور جزا و سزا کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور جنّت اور دوزخ کو بھی، اور دل میں ان تمام باتوں پر پختہ یقین رکھنا ایمان ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ایمان، کائنات اور انسان کے بارے میں علم کا حقیقی نام ہے اور اِس کے دو نتیجے لازمی ہیں:

ایک یہ کہ انسان کا اضطراب رفع ہو جائے اور اسے سکون اور اطمینان حاصل ہو جائے، اور کائنات اور خود اپنی حقیقت کا علم حاصل کرنے کی جو پیاس اس کی فطرت میں تھی اسے تسکین حاصل ہو جائے۔ چنانچہ یہ داخلی امن ہی ایمان کا اصل حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ اصطلاح 'امن' کے مادے سے اخذ کی گئی ہے۔

دُوسرے یہ کہ چونکہ بقول سقراط "علم نیکی ہے اور جہالت بدی" لہٰذا اِس علم حقیقی کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ عمل بھی دُرست ہو جائے اور انسان بہترین اخلاق سے مزیّن ہو جائے اور گھٹیا اعمال و افعال کا خاتمہ ہو جائے۔

یہ دوسری بات نہایت اہم ہے، اِس لیے کہ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور

عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایمان و عملِ صالح باہم لازم و ملزوم ہیں۔

آپ خود غور فرمایئے کہ ایک شخص تو ایسا ہے کہ جس کے نزدیک یہ کائنات ایک اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگئی ہے اور اس کا پورا نظام خود بخود چل رہا ہے اور ایک دوسرا شخص ہے جو اس کے برعکس یہ مانتا ہے کہ ایک علیم و خبیر ہستی اور عزیز و حکیم ذات نے ہی اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور اُسی کے چلائے اِس کا نظام چل رہا ہے تو کیا ان دونوں کا عملی رویّہ ایک ہی ہو سکتا ہے اور کیا اِن کے طرزِ عمل میں زمین و آسمان کا فرق واقع نہیں ہو جائے گا؟ اِسی طرح ایک شخص وہ ہے جس کے نزدیک زندگی بس یہی زندگی ہے جو ہم اِس عالم میں بسر کر رہے ہیں اور موت کے بعد کوئی زندگی نہیں، کوئی حساب و کتاب نہیں، کوئی پوچھ گچھ نہیں اور کوئی جزا و سزا نہیں اور دوسرا شخص یقین رکھتا ہے کہ اصل کتابِ زندگی تو موت کے بعد شروع ہوگی، یہ زندگی تو بس ایک دیباچے اور مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے اور مرنے کے بعد ہر انسان کو اپنے ہر ہر عمل ہی نہیں ہر ہر قول بلکہ ہر ہر خیال تک کے بارے میں جوابدہی کرنی ہوگی تو کیا اِن دونوں کے عملی رویّے میں مشرق و مغرب کا بُعد پیدا ہونا لازمی نہیں؟ سیدھی سی بات ہے کہ پہلے انسان کا تو فلسفہ ہی یہ بن جائے گا کہ ؎

بار بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!

اور اِس عیش کوشی میں نہ اسے صحیح و غلط کی تمیز رہے گی، نہ جائز و ناجائز کی اور نہ حلال و حرام کی۔ اِس کے برعکس دوسرا شخص زندگی میں ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھائے گا اور ایک احساسِ ذمّہ داری ہر دم اس کے سر پر مسلّط رہے گا۔ گویا ایمان کے نتیجہ میں انسان کی شخصیّت میں ایک انقلاب (TRANSFORMATION) لازمی ہے۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہمارے یہاں جو یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ ایمان جُدا ہے اور عمل جُدا، تو یہ صرف قانونی درجے میں ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں کسی شخص کا مسلمان سمجھا جانا صرف اس کے اقرار باللّسان پر مبنی ہے اور اس میں انسان کا عمل زیرِ بحث نہیں لایا جا سکتا لیکن وہ

حقیقی ایمان جو عبارت ہے یقینِ قلبی سے لازماً عمل میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اگر عمل میں تبدیلی پیدا نہ ہو تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ حقیقی ایمان موجود نہیں ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں واضح فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ کا ایک قولِ مبارک ہے کہ لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہٗ [1] یعنی اس شخص کا کوئی ایمان نہیں جس میں امانت کا وصف نہیں اور جو امانت (TRUST) کو ضائع (BETRAY) کرتا ہے اور جس میں عہد کی پاسداری نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔ غور کریں کتنا پیارا ہے حضورؐ کا اندازِ بیان اور کتنی دو اور دو چار کی طرح واضح ہے وہ بات جو آپ نے فرمائی ہے۔

اسی طرح ایک موقعہ پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار قسم کھا کر فرمایا: وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ ، وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ ، وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ "خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے"۔ اس پر صحابہؓ نے سوال کیا: مَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ حضورؐ کس کی بابت ارشاد فرما رہے ہیں؟ تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا: اَلَّذِیْ لَا یَا مَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ [2] یعنی وہ شخص جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا ہمسایہ چین میں نہ ہو! غور فرمائیے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر تاکید کے ساتھ ایمان کی نفیِ کلّی کا اعلان فرما رہے ہیں اور وہ بھی کسی گناہِ کبیرہ پر نہیں، شرک، قتلِ ناحق، زنا یا چوری، ڈاکے پر نہیں بلکہ صرف ایک ایسی بات پر جسے ہم زیادہ سے زیادہ بداخلاقی پر محمول کرتے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی اس خیال کے لیے گنجائش ہے کہ ایمان اور عمل دو علٰحدہ چیزیں ہیں اور باہم لازم و ملزوم نہیں؟ اس غلط فہمی کی نفی کے لیے قرآن مجید کا مستقل اسلوب یہ ہے کہ ایمان کے بعد اس کے لازمی نتیجے کے طور پر عملِ صالح کا ذکر ضرور کر دیا جاتا ہے۔

---

[1] رواہ البیہقی : عن انسؓ [2] متفق علیہ : عن ابی ہریرہؓ

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک ایمان صرف اِقرارٌ باللّسان کے درجے میں رہتا ہے یعنی صرف قول تک محدود ہوتا ہے، عمل اِس کے خلاف ہوسکتا ہے۔ اِس لیے کہ قول و فعل کا تضاد تو اِس دنیا کی ایک عام چیز ہے۔ لیکن جب یہی ایمان تصدیقٌ بالقلب کے درجے کو پہنچ جاتا ہے یعنی یقین بن کر دِل میں اُتر جاتا ہے تو پھر عمل کا بدل جانا لازمی ہے۔ اِس لیے کہ انسان کا عملی رویّہ اِس کے یقین ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ جیسے ہمیں یقین ہے کہ آگ جلادیتی ہے تو ہم آگ میں ایک انگلی تک ڈالنے کو تیار نہیں ہوتے۔ بلکہ یقین تو دُور کی بات ہے انسان کا عمل تو گمان سے بھی متاثّر ہوجاتا ہے۔ جیسے ہمیں معلوم ہے کہ تمام سانپ زہریلے نہیں ہوتے لیکن ایک گمان سا ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ سانپ زہریلا ہو، تو اس گمان کے نتیجہ میں ہم لازماً اس سے بچتے ہیں۔ تو پھر اگر کسی شخص کو یقین ہو کہ خدا ہے اور وہ سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے، میری ہر حرکت بلکہ میری زبان سے نکلنے والا ہر ہر لفظ بلکہ اس سے بڑھ کر میرے دل کا ہر ارادہ اس کے علم میں ہے اور مجھے مر کر لازماً اس کے حضور حاضر ہونا ہے اور اپنے پُورے کارنامۂ زندگی کی جواب دہی کرنی ہے، پھر نہ اِس کی سزا اور پکڑ سے کہیں بھاگ کر بچ نکلنے کا کوئی امکان ہے اور نہ ہی کسی سفارش یا کچھ دے دِلا کر چھُوٹ جانے کی کوئی صُورت ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اس کے عمل میں تبدیلی پیدا نہ ہو اور وہ گناہ اور معصیت کی زندگی بسر کرتا رہے۔ یہی امر ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس قول مبارک میں بیان ہُوا ہے کہ:

لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ [1] ــــــــــ یعنی کوئی بدکار حالتِ ایمان میں بدکاری نہیں کرتا اور نہ کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری کرتا ہے اور نہ کوئی شرابی حالتِ ایمان

---

[1] متفق علیہ: عن ابی ہریرہ رضؓ

میں شراب نوشی کرتا ہے۔ بلکہ ان گناہوں کا صدور ہوتا ہی اس وقت ہے جب کسی سبب سے حقیقی ایمان دل سے زائل ہو جاتا ہے۔ گویا ایمان اور عملِ صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں۔ بلکہ صحیح اور درست عمل اور عمدہ اخلاق اور اعلیٰ کردار ایمانِ حقیقی کا لازمی جزو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ العصر میں ایمان کے بعد نجات کی دوسری شرط کے طور پر عملِ صالح کا ذکر کر دیا گیا۔

عملِ صالح کا اصل مفہوم

عملِ صالح کا عام ترجمہ اچھے اور نیک اعمال سے کیا جاتا ہے۔ لیکن خود اس لفظ کی گہرائی میں اتریئے تو مزید حقائق پر سے پردہ اٹھتا ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف تو اس کے باوجود کہ عمل اور فعل دونہایت قریب المفہوم الفاظ ہیں ان کے معنی میں ایک باریک سا فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ فعل کسی بھی کام کو کہہ دیں گے لیکن عمل کا اطلاق عام طور پر محنت طلب اور مشقت بخش کام پر ہوتا ہے اور دوسری طرف صالح کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس میں ترقی اور نشوونما کی صلاحیت موجود ہو۔ اب ان دونوں کو جوڑیئے تو معلوم ہوگا کہ اس اصطلاح کی اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اپنا وہ اصل مقام حاصل کرنے کے لیے جس پر اس کی بالقوّہ (POTENTIALLY) تخلیق ہوئی ہے ایک محنت اور جدّوجُہد کی ضرورت ہے اور ایک چڑھائی چڑھنی لازم ہے جس کا جامع عنوان عملِ صالح ہے۔ گویا یہ وہی بات ہوئی جو کسی شاعر نے ان الفاظ میں بیان کی کہ ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

سورۃ التین متعدد اعتبارات سے سورۃ العصر سے بہت مشابہ ہے چنانچہ اُس میں اسی حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ
اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

یعنی انسان کی تخلیق اصلاً تو نہایت اعلیٰ مقام پر ہوئی تھی اور اسے جنوں پر ہی نہیں فرشتوں پر بھی فضیلت عطا کر کے خلافت و نیابتِ الٰہی سے سرفراز فرمایا گیا تھا، لیکن پھر عملاً اسے عالمِ آب و گل میں مقیّد اور نفسِ امّارہ کے پھندوں میں گرفتار کر کے گویا نیچے والوں میں سب سے نچلے مقام پر ڈال دیا گیا۔ اب اپنے اصل مقام کی بازیافت کے لیے لازم ہے کہ وہ علمِ حقیقی بھی حاصل کرے یعنی ایمان کے نور سے اپنے باطن کو منوّر کرے اور عملِ صحیح بھی اختیار کرے یعنی اعمالِ صالحہ سے اپنے ظاہر کو مزیّن کرے اور شریعت اور طریقت کی راہوں پر گامزن ہو۔ چنانچہ یہی اس کی نجات (SALVATION) کے ابتدائی لوازم ہیں۔

تواصی کے معنی

سورۃ العصر کے آخری حصّہ میں دو بار جو لفظ تَوَاصَوْا آیا ہے اس کا مصدر "تواصی" ہے اور یہ وصیّت سے بنا ہے جس کے معنی ہیں تاکید اور اصرار کے ساتھ کسی بات کی تلقین و نصیحت۔ پھر یہ مصدر بابِ تفاعل سے ہے، جس کے خواص میں ایک تو باہمی اشتراک ہے اور دوسرے شدّت و مبالغہ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک تو یہ عملِ تواصی پورے زور شور اور پوری قوّت و شدّت کے ساتھ مطلوب ہے اور دوسرے اس مرحلے پر ایک اجتماعیّت کا قیام ناگزیر ہو جاتا ہے جو باہم ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کے اصول پر مبنی ہو۔

حق کے معنی

اسی طرح لفظ حق بھی معنی و مفہوم کے اعتبار سے بہت وسیع ہے اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو واقعی ہو (یعنی محض خیالی اور وہمی نہ ہو)

یا عقل کے نزدیک مُسلّم ہو یا اخلاقاً واجب ہو یا بامقصد اور غرض و غایت کی حامل ہو (یعنی بے کار اور لایعنی و عبث نہ ہو)۔

تو معلوم ہوا کہ تواصی بالحق کے معنی ہوں گے ہر اُس بات کا اقرار و اعلان اور ہر اس چیز کی دعوت و تلقین جو واقعی اور حقیقی ہو یا عقلاً ثابت ہو یا اخلاقاً واجب ہو۔ گویا حق کے دائرے میں چھوٹی سے چھوٹی صداقت سے لے کر کائنات کے بڑے بڑے حقائق و حقوق سب داخل ہو گئے اور تواصی بالحق کے ذیل میں چھوٹی سے چھوٹی اخلاقی نصیحتوں سے لے کر اس سب سے بڑے حق کا اعلان بھی شامل ہو گیا کہ اِس کائنات کا مالک حقیقی صرف اللہ ہے اور صرف اُسی کو حق پہنچتا ہے کہ دنیا میں اُس کا حکم چلے اور اسی کا قانون نافذ ہو۔ پھر یہ کہ اِس حق کا صرف اعتراف و اعلان ہی نہ ہو بلکہ اس کی عملی تنفیذ کے لیے جدّوجُہد کی جائے۔

اس طرح تواصی بالحق کی جامع اصطلاح میں وہ سب مفہوم شامل ہیں جو قرآنِ حکیم کی بہت سی اصطلاحوں میں مضمر ہیں، جیسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر یعنی ہر نیکی اور بھلائی کی دعوت دینا اور اس کا حکم دینا اور ہر بدی اور بُرائی سے منع کرنا اور روکنا، یا تواصی بالمرحمہ یعنی لوگوں کو باہم ایک دوسرے پر شفقت اور نرمی کرنے کی تلقین و نصیحت، یا دعوت الی اللہ یعنی لوگوں کو اپنے مالکِ حقیقی کی معرفت حاصل کرنے اور عبادت اختیار کرنے کی دعوت دینا یا جہاد فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے دین کے غلبے کی جدّوجُہد کرنا اور اس کے لیے اپنی جانیں کھپانا اور مال صرف کرنا۔

صبر کا مفہوم

اسی طرح صبر کا مفہوم بھی بہت وسعت کا حامل ہے اور اس کا اصل ماحصل یہ ہے کہ انسان اپنے طے کردہ راستے پر گامزن رہے اور اس سے اُسے نہ کوئی تکلیف یا مصیبت ہٹا سکے نہ لالچ و حرص۔ گویا اِسے اپنی راہ سے نہ تو کسی قسم کے تشدّد (PERSECUTION)

سے ہٹایا جاسکے نہ کسی طرح کے طمع اور لالچ (TEMPTATION) سے، بلکہ وہ ہر صورت میں ثابت قدم رہے اور ثبات و استقلال اور پامردی و بہادری کے ساتھ حق پر خود بھی قائم رہے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتا چلا جائے۔

تواصی بالحق اور تواصی بالصبر لازم و ملزوم ہیں

جس طرح ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایمان اور عمل صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے اسی طرح تواصی بالحق اور تواصی بالصبر بھی باہم لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے کہ حق کی دعوت کو دنیا میں بالعموم گوارا نہیں کیا جاتا اور اس کی مزاحمت لازماً ہوتی ہے چنانچہ اہلِ حق کو لازماً تکالیف اور مصائب کا سامنا رہتا ہے۔

ہم سب کو اس کا تجربہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی نصیحت بھی بسا اوقات لوگوں کو سخت ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کو کسی دوسرے کے پانچ روپے ادا کرنے ہوں اور وہ لیت و لعل سے کام لے رہا ہو اور آپ اس سے کہیں کہ بھلے آدمی اس کے پانچ روپے ادا کر دو تو اس کی تیوری پر بل پڑ جائیں گے اور وہ آپ سے سخت طیش میں کہے گا کہ آپ کون ہوتے ہیں ہمارے معاملے میں دخل دینے والے؟ اس پر قیاس کر لیجیے کہ جب بڑے بڑے حقوق کی ادائیگی کی تلقین ہو تو کیسی کچھ ناگواری (RESENTMENT) کا سامنا کرنا ہوگا اور کتنی مزاحمت و مخالفت سے سابقہ پیش آئے گا۔

اور یہی مقام اصل میں انسان کی سیرت و کردار کے امتحان کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حق کی پہچان اور اس کی معرفت اتنی مشکل نہیں جتنا اس کو خود بھی اختیار کرنا اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دینا اور پھر اس راہ میں ثابت قدم رہنا جسے قرآنِ مجید کی اصطلاح میں استقامت کہتے ہیں۔ اسی مرحلہ پر آکر معلوم ہوتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے اور آیا سیرت و کردار نام کی کوئی چیز اس کے پاس موجود ہے یا نہیں!

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں بڑے شدّومدّ (EMPHASIS) اور نہایت تاکید و توثیق کے ساتھ یہ حقیقت بیان ہوئی کہ اہلِ ایمان کو لازماً امتحان اور ابتلاء و آزمائش سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان کے دعویٰ ایمان کی صداقت کو طرح طرح سے جانچا اور پرکھا جاتا ہے اور صادق الایمان وہی قرار پاتے ہیں جو ان امتحانات میں ثابت قدم رہیں اور صبر و استقلال کا عملی ثبوت پیش کریں۔

ایمان، عملِ صالح اور تواصی کا باہمی ربط

اب تک ہم نے سورۃ العصر میں بیان شدہ نجات کی چار شرائط کو دو دو کے دو جوڑوں میں تقسیم کر کے دیکھ لیا ہے کہ ایک طرف ایمان اور عملِ صالح لازم و ملزوم ہیں اور دوسری طرف تواصی بالحق اور تواصی بالصبر بھی باہم لزوم رکھتے ہیں۔ اب ان دو جوڑوں کے مابین جو رشتہ اور تعلّق ہے اسے بھی سمجھ لیں تو بات پوری ہو جائے گی۔

یہ فطرت کا عام اصول ہے کہ کوئی شے نہ ماحول سے متأثر ہوئے بغیر رہ سکتی ہے نہ اسے متأثر کیے بغیر۔ برف میں جو خنکی ہے وہ اپنے ماحول میں لازماً سرایت کرے گی اور آگ کی حرارت اپنے ماحول کو لازماً گرم کر دے گی۔ یہی معاملہ اخلاقیات کے میدان میں ہے۔ اگر کسی انسان میں عملِ صالح حقیقتہً پیدا ہو جائے تو وہ لازماً ماحول میں اثر و نفوذ کرے گا اور اس سے نیکی اور بھلائی لازماً پھیلے گی۔ گویا عملِ صالح کا فطری نتیجہ تواصی بالحق ہے۔ انسانی اخلاقیات میں یہ اصول اور بھی شدّت کے ساتھ کارفرما ہوتا ہے۔ اگر اجتماعی ماحول خراب ہے تو اس کی خرابی لازماً افراد کی زندگیوں میں سرایت کرے گی اور اس سے بچنے کی ایک ہی راہ ممکن ہے کہ ماحول کو تبدیل کر دیا جائے یا کم از کم اس کو تبدیل کرنے کی جدّوجہد مسلسل جاری رکھی جائے۔ اس طرح اگر ماحول نہ بھی تبدیل ہو تو کم از کم وہ فرد "جارحیت بہترین دفاع ہے!" (BEST DEFENCE IS OFFENCE) کے اصول پر

عمل پیرا ہو کر اپنا دفاع ضرور کرے گا۔ اسی لیے حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ"[1] تم میں سے جو کوئی کسی بُرائی کو دیکھے اس کا فرض ہے کہ اسے بزورِ بازو (نیکی سے) بدل دے، پھر اگر اس کی قوت نہ رکھتا ہو تو زبان سے ضرور منع کرے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل سے ضرور مدافعت کرے یعنی دل میں ضرور بُرا جانے اور اس کو نہ روک سکنے پر متاسف ہو اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

پھر تواصی بالحق انسان کی شرافت کا بھی لازمی تقاضا ہے۔ اس لیے کہ جو حق کسی انسان پر منکشف ہوا ہے اور جسے خود اس نے اختیار کیا ہے اس کی انسان دوستی کا لازمی تقاضا ہے کہ اسے دوسروں کے سامنے بھی پیش کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ انسان اس سے نفع اندوز ہوں اور اس کی برکتوں سے متمتع ہو سکیں۔ اسی لیے آنحضورؐ نے فرمایا کہ: لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ[2] یعنی تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں قرار پا سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

اور آخری درجہ میں یہ انسان کی غیرت اور حمیّت کا تقاضا بھی ہے کہ جس حق کو اس نے خود قبول کیا ہے اس کا پرچار کرے، اس کا مُبلّغ اور علمبردار بنے اور اس کا بول بالا کرنے کے لیے تن من دھن سے جدّوجہد کرے۔

سیدھی سی بات ہے کہ اگر انسان ایک خاص طرز کو اختیار کرتا ہے اور ماحول کسی اور رنگ میں رنگا ہوا ہے تو نظری طور پر دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ ع زمانہ باتو نسازد

---

[1] رواہ مسلم: عن ابی سعید الخدریؓ [2] رواہ مسلم: عن انسؓ بن مالک

تو با زمانہ بساز! کے مطابق خود بھی ماحول ہی کے رنگ میں رنگا جائے تاکہ دُوئی ختم ہو جائے اور تصادم باقی نہ رہے، اور دوسرے یہ کہ ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز!" کی روش اختیار کر کے اور ماحول سے ٹکر لے کر اسے اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک شریف، باوقار، غیور اور باحمیت انسان تو صرف ایک ہی راہ اختیار کر سکتا ہے اور وہ دوسری ہے نہ کہ پہلی۔ وہ اس کو تو گوارا کر لے گا کہ "بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا!" کے مصداق اپنی جان دے دے، لیکن اسے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ تن آسانی اور عافیت کوشی کی راہ پر چل کر حق سے غداری کا مرتکب ہو جائے۔

الغرض ——— جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے نظر یہی آتا ہے کہ ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ایک جانب تو نجات کے ناگزیر لوازم ہیں اور دوسری جانب خود باہم لازم و ملزوم ہیں۔ بلکہ ان چاروں پر علٰحدہ علٰحدہ قدرے گہرائی میں اتر کر غور کرنے سے جو حقیقت منکشف ہوتی وہ یہ ہے کہ یہ چاروں ایک ہی وحدت کے ناقابلِ تقسیم پہلو ہیں اور ایک ہی کُل کے اجزائے غیر منفک ہیں۔ گویا بقول اقبالؒ عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ع "یہ سب کیا ہیں فقط اِک نقطۂ ایماں کی تفسیریں"۔ ایمان اگر حقیقی ہو جائے تو اس سے عملِ صالح ضرور پیدا ہو گا، اور عملِ صالح اگر پختہ ہو جائے تو لازماً تواصی بالحق پر منتج ہو گا اور تواصی بالحق اگر واقعی اور حقیقی ہے تو تواصی بالصبر کا مرحلہ لازماً آکر رہے گا ——— یہاں تک کہ اس کی عکسی صُورت (CONVERSE PREPOSITION) بھی بالکل دُرست ہے یعنی یہ کہ تواصی بالصبر کا مرحلہ نہیں پیش آیا تو یہ قطعی ثبوت ہے اس کا کہ دعوت پُورے حق کی نہیں ہے بلکہ اس کے صرف کسی بے ضرر سے جُزو کی ہے، اور اگر دعوت کا مرحلہ نہیں آتا تو یہ حتمی ثبوت ہے اس کا کہ انسان کا اپنا عمل صحیح اور پختہ نہیں ہے، اور اگر عمل درست نہیں ہو رہا تو یہ یقینی ثبوت ہے اس کا کہ ایمانِ حقیقی ہی موجود نہیں۔

گویا سورۃ العصر نجات کی جس شاہراہ کی طرف راہ نمائی فرماتی ہے اور انسانی کامیابی

کے لیے جس صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتی ہے اس کے چار سنگ ہائے میل ہیں۔ پہلا ایمان، دوسرا عملِ صالح، تیسرا تواصی بالحق اور چوتھا تواصی بالصبر۔

اسوۂ محمدی

اور اس کی کامل اور مکمل مثال ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ جس میں یہ چاروں چیزیں اپنی بلند ترین شان کے ساتھ بتمام و کمال موجود ہیں۔

حضورؐ نے سب سے پہلے اپنی اور کائنات کی حقیقت پر مطلع ہونا چاہا اور جب بفحوائے "وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى" کے جبریلِ امینؑ نے حقائق کا کامل انکشاف کیا تو اس کی تصدیق کی اور ایمان لے آئے۔ جیسے کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔" ایمان لایا رسولؐ اس پر جو نازل کیا گیا اس پر اس کے ربّ کی جانب سے اور ایمان لائے اہلِ ایمان۔"

دوسری طرف آپ کی زندگی اخلاقِ حسنہ کا کامل نمونہ اور خُلقِ عظیم کا شاہکار تھی جیسے کہ فرمایا گیا وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" آپ یقیناً نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل اور اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔"

ایمان اور عملِ صالح کے ان بنیادی تقاضوں کو بتمام و کمال پورا کرنے کے بعد پھر مسلسل تیئس برس حضورؐ نے حق کی دعوت اور ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی کبریائی کے اعلان و نفاذ کی انتھک جدّوجہد میں صرف کیے اور اس راہ میں ہر تکلیف سہی، ہر مصیبت کو برداشت کیا، ہر مشکل کو جھیلا اور ہر مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ چنانچہ شعب بنی ہاشم میں تین سال کی شدید ترین قید کی صعوبت بھی سہی، طائف کے بازاروں میں اوباشوں کی فقرہ بازی اور سنگ باری بھی برداشت کی، بدر اور اُحد میں خود اپنے دندانِ مبارک کے علاوہ اپنے قریب ترین اعزّہ اور عزیز ترین جاں نثاروں کی جانوں کا ہدیہ بھی بارگاہِ ربّانی میں پیش کیا،

اور تیئس برس کی شبانہ روز محنت اور مشقت سے بالآخر حق کا بول بالا کر دیا اور خدا کے دین کو جزیرہ نمائے عرب میں غالب کر کے ہی رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت اختیار فرمائی۔

فصلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم تسلیماً کثیراً۔

گویا آنحضورؐ کی حیاتِ طیبہ سورۃ العصر کی مجسّم تفسیر ہے! فداہ ابی وامّی۔

تو حضرات! یہ ہے سورۃ العصر کے مفہوم کی مختصر تشریح۔ اب آپ کو اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کیوں میں نے اسے قرآن مجید کی جامع ترین سُورۃ قرار دیا تھا' اور کیوں امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ اگر لوگ غور و فکر سے کام لیں تو تنہا یہی مختصر سی سُورۃ ان کی ہدایت و راہ نمائی کے لیے کافی ہے۔

سورۃ ماقبل اور سورۃ مابعد سے تعلّق

اب ذرا ایک نظر قرآن مجید میں اس سورۃ مبارکہ کی سابق اور لاحق سورتوں پر بھی ڈال لیجئے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ انسان کے رویّے کی درستی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس کے دِل و دماغ میں کامیابی اور ناکامی کا اصل معیار اور نفع و نقصان کا صحیح تصوّر نہ صرف یہ کہ جاگزیں ہو جائے بلکہ ہمیشہ مستحضر بھی رہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر لازماً انسان کے سامنے ایک ہی چیز بطورِ مقصود و مطلوب رہ جاتی ہے اور وہ ہے مال و اسبابِ دنیوی کی بہتات اور کثرت کی طلب، جو اس کے دِل و دماغ پر اس درجہ مسلّط اور مستولی ہو جاتی ہے کہ کائنات اور خود اپنی زندگی کی عظیم حقیقتوں سے غافل کر دیتی ہے اور غفلت کا یہ پردہ صرف موت ہی پر چاک ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی کیفیت کا بیان ہے اس سورۃ مبارکہ میں جو قرآن مجید میں سورۃ العصر سے پہلے ہے یعنی سورۃ التکاثر۔

اور پھر اس کا جو نتیجہ نکلتا ہے یعنی یہ کہ انسان صحیح و غلط میں بھی تمیز نہیں کرتا اور جائز و ناجائز اور حلال و حرام کا فرق بھی بالکل اُٹھا دیتا ہے یہاں تک کہ دولت کے انبار لگا لینے

کو اصل کامیابی سمجھ بیٹھتا ہے اور اخلاق کے تمام محاسن سے تہی دست ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت تمام معائب کی جامع ہو جاتی ہے۔ تو اس کی تصویر کھینچ دی گئی ہے اس سورۃ میں جو سورۃ العصر کے بعد ہے یعنی سورۃ الہُمَزَۃ۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میرا اور آپ کا حشر ایسا ہو اور ہم اس انجامِ بد سے دوچار ہوں۔

خاتمۂ کلام

آخر میں مَیں آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری اِن طویل گذارشات کو نہایت توجہ سے سُنا اور بارگاہِ خداوندی میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کی پہچان اور معرفت بھی عطا فرمائے اور اس پر عملاً قائم ہونے کی توفیق بھی عطا فرمائے اور دوسروں کو اس کی طرف بلانے اور دعوت دینے کی ہمت اور اس راہ کی مصیبتوں اور تکالیف پر صبر کی توفیق بھی ارزانی فرمائے!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

ضمیمہ (۱)

سُورۃ العصر

سے متعلق :

۱۔ صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل

۲۔ امام شافعیؒ کے حکیمانہ اقوال

۳۔ امام رازیؒ کا قولِ فیصل

۴۔ احادیثِ نبویؐ کی تخریج

۱۔ سُورۃ العصر سے متعلق

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا طرزِ عمل

عَنْ اَبِی مُزَیْنَۃَ الدَّارِمِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ :
"کَانَ الرَّجُلَانِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا الْتَقَیَا لَمْ یَتَفَرَّقَا حَتّٰی یَقْرَأَ اَحَدُھُمَا عَلَی الْاٰخَرِ سُوْرَۃَ الْعَصْرِ ثُمَّ یُسَلِّمُ اَحَدُھُمَا عَلَی الْاٰخَرِ"

(اَخْرَجَہُ الطبرانی فی الاوسط والبَیْھَقِی فی الشُّعَب)

ترجمہ

حضرت ابو مزینہ دارمیؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہ میں سے دو حضرات جب باہم ملاقات فرماتے تو اس وقت تک ایک دُوسرے سے جُدا نہ ہوتے جب تک ان میں سے ایک دُوسرے کو سُورۃ العصر نہ سنا لیتا۔ اس کے بعد ہی ان میں سے ایک دُوسرے کو (الوداعی) سلام کہتا!

۲۔ سُورۃ العصر کے بارے میں

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو حکیمانہ اقوال

(۱)

"لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ هٰذِهِ السُّوْرَةَ لَوَسِعَتْهُمْ"

(بحوالہ تفسیر ابن کثیرؒ)

"اگر لوگ اس سورۃ (سُورۃ العصر) پر غور کریں تو وہ اسی میں پُوری رہنمائی اور کامل ہدایت پالیں گے۔"

(۲)

"لَوْ لَمْ يُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْاٰنِ سِوَاهَا لَكَفَتِ النَّاسَ"

(بحوالہ تفسیر پارۂ عمّ از محمد عبدہٗ)

"اگر قرآن حکیم میں سوائے اس سورۂ مبارکہ کے اور کچھ بھی نازل نہ ہوتا تو صرف یہ سورۃ ہی لوگوں (کی ہدایت) کے لیے کافی ہوتی۔"

۳۔ تفسیر سورۃ العصر کے ضمن میں

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا قولِ فیصل

هٰذِهِ الْاٰيَةُ فِيهَا وَعِيْدٌ شَدِيْدٌ وَذٰلِكَ لِاَنَّهٗ تَعَالٰى حَكَمَ بِالْخِسَارِ عَلٰى جَمِيْعِ النَّاسِ اِلَّا مَنْ كَانَ اٰتِيًا بِهٰذِهِ الْاَشْيَاءِ الْاَرْبَعَةِ : وَهِيَ الْاِيْمَانُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ وَالتَّوَاصِي بِالْحَقِّ وَالتَّوَاصِي بِالصَّبْرِ، فَدَلَّ ذٰلِكَ عَلٰى اَنَّ النَّجَاةَ مُعَلَّقَةٌ بِمَجْمُوْعِ هٰذِهِ الْاُمُوْرِ وَاَنَّهٗ كَمَا يَلْزَمُ الْمُكَلَّفَ تَحْصِيْلُ مَا يَخُصُّ نَفْسَهٗ فَكَذٰلِكَ يَلْزَمُهٗ فِيْ غَيْرِهٖ اُمُوْرٌ: مِنْهَا الدُّعَاءُ اِلَى الدِّيْنِ وَالنَّصِيْحَةُ وَالْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

ترجمہ

اس آیۂ مبارکہ میں بڑی سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی تباہی کا فیصلہ صادر فرما دیا ہے سوائے ان کے جو ان چار شرائط کو پورا کریں یعنی ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر اس سے معلوم ہوا کہ نجات ان چاروں کے مجموعے پر منحصر ہے اور ہر انسان جس طرح اپنی ذات کے بارے میں مسئول ہے (ایمان اور عملِ صالح کے لیے) اسی طرح دوسروں کے بارے میں بعض امور کا مکلّف ہے جیسے دین کی دعوت، تلقین و نصیحت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

۴-اِس کتابچے میں مذکور

احادیثِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تخریج

(۱)

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَّا قَالَ: "لَا إِيْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ" (رواه البيهقي في شُعَبِ الإيمان)

(۲)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ" قِيْلَ: "مَنْ يَا رَسُوْلَ اللهِ؟" قَالَ: "اَلَّذِيْ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ!" (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

(۳)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا يَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ ....." الحديث (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

(۴)

عَنْ أَبِي سَعِيدِنِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: "مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَراً فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ" (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

(۵)

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ" (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

(۶)

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَوْحَى اللهُ عَزَّوَجَلَّ إِلٰى جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِأَهْلِهَا" قَالَ فَقَالَ: "يَا رَبِّ إِنَّ فِيْهَا عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ" قَالَ فَقَالَ: "اِقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ فَإِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ!" (امام بیہقی بحوالہ خطبات الاحکام تالیف: مولانا اشرف علی تھانویؒ)

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْ عِبَادِكَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ اٰمين، يَارَبَّ الْعٰلَمِيْن !!

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ